

دکھا جائے کہ تم حکمرانہ انتہارٹی کے ساتھ اپنی رائے دوسروں پر ٹھونکنا چاہتے ہو۔

سلمی صاحب یہ بھی فرماتے ہیں کہ نظریات و تصورات کے انتخاب کا حق عوام کو ہونا چاہیئے۔ ضرور ہونا چاہیئے۔ چنانچہ مولانا مودودی اور جماعت اسلامی نے عوام کے اسی حق کو سامنے رکھ کر اسلامی دستور اور اسلامی نظام کے تصورات ہمیشہ عوام تک پہنچائے ہیں اور جو مطالبہ بھی پیدا ہوا ہے عوام ہی کے اندر سے پیدا ہوا ہے۔ پھر ادارہ میں لکھا گیا ہے کہ پارلیمینٹری ادارات عوام کے اجتماعی تصور اسلام کے اظہار کا مناسب ترین ذریعہ ہیں۔ اور اسی ذریعہ سے کسی چیز کو نافذ ہونا چاہیئے۔ سوال یہ ہے کہ کیا مودودی صاحب یا جماعت اسلامی نے کوئی مسلح بغاوت کر کے یا کسی با اختیار فرد کے سر پر ہتھول رکھ کر کوئی بات آج تک منوائی ہے اور کبھی پارلیمینٹری راستے سے ہٹ کر اپنے دستوری تصورات کو ملک پر مسلط کرنے کی کوشش کی ہے؟ اب تک اس سلسلے میں جو کچھ ہوا ہے انھی پارلیمینٹری ادارت کے ذریعے ہوا ہے۔ قرارداد مفاد اسی ذریعے سے پاس ہوئی تھی، رہنما اصول اسی طریقے سے طے پائے تھے اور مودودہ دستور نے ایک خاص شکل اسی طریقے سے اختیار کی تھی۔ لیکن دوسری طرف سے اس دوران میں قدم قدم پر رتبے عام کو دبائے اور اس سے انحراف کرنے اور اس کے خلاف سازشیں کرنے کی تدبیریں لڑائی جاتی ہیں۔ آخر میں جب ان تدبیروں کے علی الرغم کسی نہ کسی حد تک اسلامی خطوط پر دستور سازی کا کام مکمل کو پہنچا تو سرے سے دستور یہ کا وجود ہی ختم کرنے کی کوشش کر ڈالی گئی۔

ایک ایک حرف جو سلمی صاحب نے لکھا ہے کہ یہ ہونا چاہیئے اور یہ نہ ہونا چاہیئے، وہ ٹھیک اسی موقف کی تصویر میں کرتا ہے جسے جماعت اسلامی نے اختیار کیا ہے۔ سمجھ میں نہیں آسکا کہ پھر اعتراض کس چیز پر ہو رہا ہے اور درس عبرت کس معاملے میں دیا جا رہا ہے؟

ہاں! آخر میں یہ بھی پوچھنے کو جی چاہتا ہے کہ جن عوام کو سلمی صاحب بار بار فاضل انتہارٹی اور فیصلہ کن طاقت قرار دے رہے ہیں، ان کی انتہارٹی اور ان کے اختیار کی کیا گت گذشتہ سات برس میں بنتی رہی ہے اور آج کیا بن رہی ہے۔ عوام کو اب کسی نے پوچھا ہے کہ تم کون ہو، کہاں رہتے ہو، کس طرح سوچتے ہو، کیا چاہتے ہو؟ مسلم لیگ کا تعلق پاکستانی شیعہ عوام سے کٹ چکا حکمران طبقہ کا حال یہ ہے کہ وہ پہلوں میں چلتا ہے اور ریڈیو پر سے وعظ کہہ دیتا ہے۔ کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ ہمارے اکابر کسی مسئلے کو لے کر میدان میں آئیں، لوگوں کی آنکھوں سے آنکھ ملا کر بات کریں، اپنے دلائل اور ان کے دلائل نہیں، معلوم کریں کہ ان کے مسائل اور مطالبات کیا ہیں، وہ کیسا نظام زندگی چاہتے ہیں اور وہ کن تبدیلیوں کے لیے ہیں؟

انسانی نہیں کہ عوام سے قریب ہو کر ان کے دلوں کی دھڑکنیں سنی نہیں جاتیں، اٹا یہ ہوتا ہے کہ عوام کسی مسئلے پر جب مطالبات لے کر اٹھتے ہیں اور ان کے اضطراب کی لہریں ملک کے گوشے گوشے سے آ کر ایوانِ اقتدار سے ٹکرائی ہیں تو ایوان کے دروازے بند کر لیے جاتے ہیں۔ کیا سہری صاحب کو یہ معلوم نہیں کہ دستور کے مسئلے پر پوری قوم نے یک جہتی سے کچھلے سات سالوں میں کیا تمنائیں و سنواریاں اور حکمران پارٹی کے سامنے رکھی ہیں؟ کیا سہری صاحب ناواقف ہیں کہ مائیکل کے ایسروں کے بارے میں ملک کی کوئی تنظیم اور کوئی کمیٹی ایسی نہیں رہی جس کی طرف سے صریح بے انصافی کے ازالہ کا مطالبہ نہ کیا گیا ہو؟ پھر ان اصل اتھارٹی اور اختیار رکھنے والے عوام کو کیا جواب ملا؟

اب تو عوام کے متعلق ذمہ دار ترین لوگوں کی طرف سے کھلم کھلا یہ کہا جانے لگا ہے کہ یہ جمہوریت کے دل نہیں، معاملات کی سوچ بوجھ نہیں رکھتے، مذہبی رومن بہہ جاتے ہیں اور ہکانے والوں کے ہاتھوں میں کھیل جاتے ہیں۔ جن عوام کو یہ سن کر سر ٹھٹھکیٹ دیا جا رہا ہو، ان بچاروں پر فاضل اتھارٹی ہونے کا الزام بہت ہی بڑی زیادتی ہے۔ ناحق ہم مجبوروں پر یہ قہمت ہے خناری کی۔ چاہتے ہیں جو آپ کی پی پی پی کو عبث بدنام کیا۔ یہ اگر آپ لوگوں کی ہر بات ایمان لے آیا کریں تب تو یہ فاضل اتھارٹی ہونے کے حق دار ہوں بھی، لیکن جب یہ اپنے مذہب کو سینے سے لگائے ہوئے ہوں اور کوئی صدامے اختلاف بند کر دیں تو پھر یہ جمہوریت سے نوازے جانے کے مستحق ہی نہیں رہتے۔

فی الواقع اگر آپ لوگ عوام کو آخری فیصلہ کن طاقت قرار دیتے ہیں تو آئیے، آج آئیے اور اپنے نظریات و تصورات کو آپ ان کے سامنے رکھ دیجیے اور دوسری طرف تمام دوسرے لوگوں کو موقع دیجیے کہ وہ بھی اپنے اپنے نظریات و تصورات پیش کر دیں۔ ایک کھلے کھلے استصواب رائے کے ذریعے فیصلہ کر لیجیے کہ آخری فیصلہ کن طاقت کس کو قبول کرتی ہے اور کسے رد کرتی ہے۔

(۳)

اب بحث کا تیسرا حصہ سامنے آتا ہے اور اصل نتیجہ برآمد ہوتا ہے، مایا یوں کہئے کہ جو سبق سہری صاحب پاکستان کو دینا چاہتے ہیں وہ اس حصے میں دیا جا رہا ہے۔ اس نتیجے یا سبق کے دو جزو ہیں۔ ایک یہ کہ اسلام کے نام پر ریاست کے میدان میں کسی کو کام کرنے کا موقع نہ دیا جائے۔ دوسرے یہ کہ کسی کے نظریات و دوسروں پر پھونسنے نہ جائیں۔ بحث کے حصے میں بھی ان دو نکات کو پیش کرتے ہوئے ایسی باتیں کہی گئی ہیں کہ جن کا نفاذ نہ جائزہ لینا مفید ہوگا۔

سیاسی تنظیمیں اسلامی نہ ہونی چاہئیں | سہری صاحب بتاتے ہیں کہ سیاسی جماعتوں کو باہم دگر اختلاف و تنقید سے کام لینا چاہئے

اور اس بنا پر یہ اوقات برا بھلا کہنا پڑتا ہے۔ مثلاً انگلستان کے ٹوری سوسلسٹوں کو انشاریز (ANARCHIC) اور نظم شکن قرار دیتے ہیں۔ دوسری طرف سے پلٹ کر اعتدال پسندوں (CONSERVATIVES) کو خون چوسنے والے مریض وار کہا جاتا ہے۔ اب بڑا پیچیدہ مسئلہ یہ پیدا ہو جاتا ہے کہ اگر ایک سیاسی تنظیم اسلام کی علمبردار بن کے اٹھے، مثلاً جماعت اسلامی، تو وہ اپنے مخالفین کو کیا کہے گی؟ جس کا نام گلوچ ہے یہ اپنے دائرے سے باہر کے لوگوں کی توضیح کر سکتی ہے وہ کافر اور ملحد کہنے کے علاوہ اور کیا ہوگی؟ یہ پیچیدہ مسئلہ پیش کرتے ہوئے سہری صاحب اس کے عملی ثبوت کے طور پر یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ جماعت اسلامی آٹے دن اختلاف کرنے والوں کے لیے ہی کلمات استعمال کرتی رہتی ہے، چنانچہ مسودہ دستور میں ترمیم چاہنے والوں کے خلاف اس کے ترجمان نے ٹھیک ہی انداز اختیار کیا تھا۔

پہلے اس عملی ثبوت کے بارے میں بات کر لینا ضروری ہے۔ مارچ ۱۹۷۷ء میں مسودہ دستور میں ترمیم کرانے کے لیے نہیں بلکہ دستور پر نوٹرو کا مشورہ نعرہ متحدہ محاذ کی طرف سے اٹھا تھا۔ اس نعرے کے بارے میں خود مسلم لیگی اور سرکاری اور قوم پرست حلقوں نے یہی تاثر دیا تھا کہ یہ کچھ کمیونسٹوں تحریک پسندوں، مفاد پرستوں اور اسلامی دستور کے مخالفوں کا اٹھایا ہوا نعرہ ہے۔ یہ بھی واقعہ ہے کہ کمیونسٹ اور اسلامی دستور سے چڑنے والے عناصر جہاں جہاں بھی تھے انھوں نے اس کی تائید میں پورا زور صرف کیا تھا۔ جماعت اسلامی کی مجلس شوریٰ نے ایک قرارداد میں اس تحریک پر نعرہ کی تردید کرتے ہوئے اس کے علمبردار عناصر کو غرض ایک واقعہ ہونے کی حیثیت سے پیش کر دیا تھا کہ یہ آواز کیسے لوگوں کی ہے۔ درحقیقت اس استباہ کا مقصد صرف یہ تھا کہ ایسے لوگوں کے اٹھائے ہوئے نعرے کی گہرائیاں عام لوگ سمجھیں اور کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہوں، نہ یہ کہ جو کوئی بھی اخلاص یا غلط فہمی کے تحت اسے اختیار کرتا جائے۔ اس پر ایک مذہبی گالی چسپاں ہوتی چلی جائے۔ دوبارہ یہی نعرہ اکتوبر میں اٹھا تو پھر اس کی پہلی ”ہو“ انھی صفوں سے بلند ہوئی جن کو مارچ سے لوگ جانتے تھے۔ اب یہ تو ”اسرارِ درون پر“ کا معاملہ تھا کہ اقتدار کے لیے ٹکٹمن کرنے والے دو دھڑوں میں سے ایک نے اندر ہی اندر اس رد شدہ نعرے سے کوئی مفید کام لینے کا فیصلہ کر لیا۔ اب اس نعرے کے جھنڈے تلے بڑے بڑے حضرات کا ہوا انہو جمع ہو گیا تھا ان میں سے ہر ایک خواہ مخواہ ان الفاظ کو اپنے اوپر اوڑھ کر مظلومی کی شان سے سامنے آتا ہے کہ دیکھیے جماعت اسلامی والے اپنے سوا دوسروں کو ملحد اور کمیونسٹ کہتے ہیں۔ بھائی کے معلوم تھا کہ آپ جیسے اسلام نواز حضرات بھی اب اس جھنڈے تلے جمع ہو جائیں گے جسے گارڈ نے والوں نے جب کاٹا تھا تو خود آپ ہی کی صفوں سے ان کو کمیونسٹ اور ملحد کہا گیا تھا۔

اب لیجئے، جماعت اسلامی کی روش کو۔ جماعت کا طریقہ سرگز یہ نہیں ہے کہ وہ مجرد اختلاف کرنے کی بنیاد پر کسی بھی
 مومن کو کافر یا ملحد یا کچھ اور کہے۔ وہ اپنے آپ سے ہر فرد بشر کو اختلاف کا کھلا حق دیتی ہے، اور دوسروں کے مقابلے میں
 یہی حق اپنے لیے چاہتی ہے۔ اختلاف جیسا کسی سے ہوتا ہے، اسی کے مطابق وہ اس کی فکری پوزیشن کو بیان کر دیتی ہے۔
 مثلاً اگر کوئی جمہوریت کے کسی اصول سے انحراف کرتا ہے تو وہ اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتی کہ یہ جمہوریت کی مخالفت ہے۔
 قانون و عدل کے صریح تقاضوں سے کوئی روگردانی کرتا ہے تو وہ فقط یہی کہتی ہے کہ یہ انصاف اور قانون کا غم احترام ہے۔
 کوئی معاشی دائرے میں استحصال کرتا ہے تو وہ یہ کہتی ہے کہ یہ سرمایہ دارانہ یا جاگیردارانہ اطوار ہیں۔ نہ یہ کہ وہ ہر اختلاف کو
 دوسروں کو کافر اور ملحد کہہ ڈالتی ہو۔ پھر جہاں تک تکلیف کے الزام کا تعلق ہے، اس سے جماعت کا دامن قطعاً پاک ہے "ملحد"
 اور کمیونسٹ کے الفاظ البتہ ایسے ہیں جو اپنے ناگزیر موقعوں پر استعمال ہوئے ہیں۔ الحاد اس کو کہتے ہیں کہ اسلام کو ماننے والے
 آدمی اس میں یزیدہ لگا لے اور انحراف کی کھلی کھلی صورتیں اختیار کرے۔ اب سہری صاحب اپنے معاشرے کو سامنے رکھ کر
 بتائیں کہ کیا یہاں مسلمانوں کے ناموں کے ساتھ ایسے بے شمار افراد موجود نہیں ہیں جو اسلام کا مذاق اڑاتے ہیں، اسلامی
 نظام کو ڈھکوسلہ سمجھتے ہیں، اسلام کے دستوری تصورات پر پھبتیاں کتے ہیں، اس کے عملی تقاضوں سے فرار کرنا چاہتے
 ہیں اور اس کے اجتماعی مطالبات کو رد کرتے ہیں؟ اگر سہری صاحب چاہیں تو ہم نام لے کر ان ممتاز ہستیوں کا تعارف
 کر ادیں جو پاکستان کے اسلامی ریاست قرار پانے کی صورت میں شرم کے مارے اپنی گردن دنیا کے سامنے اٹھانے کے
 قابل نہیں رہتے، جو قراردادِ مقاصد کو اس نقطہ نگاہ سے دیکھنے والے ہیں کہ جیسے پاکستان کے دامنِ عزت پر کوئی گھناؤنا
 دھبہ لگ گیا ہے، جن کا حال یہ تھا مسودہ دستور میں ریاست کے تسمیہ (NOMENCLATURE) کی دفعہ نے
 جب پاکستان کا نام جمہوریہ اسلامیہ پاکستان تجویز کر دیا تو وہ بیچ ذناب کھاتے رہ گئے۔ آخر جب یہ عنصر ہمارے ہاں
 موجود ہے اور جب کمیونسٹوں کی ایک تعداد یہاں کام کر رہی ہے تو کوئی بھی کام کرنے والی جماعت ان کے موجود ہونے
 کیسے آنکھیں بند کر سکتی ہے اور کیسے ان کی حرکات سے چشم پوشی کر سکتی ہے۔ یہ عناصر اگر کوئی اقدام اپنے نظریات کے
 مطابق کریں گے تو اس کام کو انہی سے منسوب کیا جائے گا، نہ یہ کہ ملحد اور کمیونسٹ عناصر کے کارناموں کو جمعیت العلماء اور
 مسلم لیگ کے نام سے بیان کیا جائے۔ ان عناصر کے لیے آخر آپ کو کتنا نام تجویز کر کے دیتے ہیں کہ اس سے ان کو ہجوم
 کر کے بات کی جائے۔

اصل الجھن جس وجہ سے پیدا ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ دنیا میں بہتر فکر اور ہر مسلک کے لوگ اپنے آپ کے جزا کے ساتھ ایسے نام سے پیش کرتے اور ایسے نام سے موسوم ہونا چاہتے ہیں جو ان کے طرز فکر اور مسلک کو ظاہر کرتا ہو۔ لیکن ہماری صفوں میں ملحد اور کمیونسٹ دونوں ہی عنصر یہ عجیب پوزیشن اختیار کر کے رہنا چاہتے ہیں کہ وہ خیالات، طرز عمل اور سرگرمیوں کے لحاظ سے تو اتحاد اور کمیونزم کے علمبردار ہیں۔ لیکن اخلاقی جزا کی کمی کی وجہ سے اپنے آپ کو ملحد اور کمیونسٹ کے نام سے سامنے نہیں لاتے۔ اب اگر کوئی دوسرا ان کے خیالات اور مسلک کے نام سے ان کا صحیح نام لے دیتا ہے تو وہ اس کے گلے پڑ جاتے ہیں کہ تم اختلاف کرنے والوں کو گالی دیتے ہو! معلوم ہوا کہ یہ لوگ ایک مسلم معاشرے میں اپنا کام منافقت کی ایک نقاب ڈال کر جاری رکھنا چاہتے ہیں اور اگر کوئی اس نقاب کو سر کاٹتا ہے تو یہ آپے سے باہر ہو جاتے ہیں۔ اسلامی نظام کے خلاف صریح طور پر بغض رکھنے والے، اسلامی دستور کا ذکر چھپتے ہی پسیدہ پسیدہ جملے والے اور کتاب و سنت کا نام آتے ہی استغناء پذیر ہو جانے والے سب کے سب یہ بھی چاہتے ہیں کہ وہ اپنے خیالات اور طرز فکر کے لحاظ سے ہرگز نہ پہچانے جائیں، بلکہ اسلام کے مخلص ترین خادموں میں شمار ہوں۔ سلمری صاحب! یہ پردہ منافقت ہے جو اصل پیچیدگی پیدا کرتا ہے۔ یہ تجا دیکھیے تو کوئی الجھن نہیں ہوگی۔ کچھ لوگ اپنے آپ کو صاف خدا طرعی سے اگر اسلامی نظام کی دعوت کے ساتھ لا رہے ہیں، تو کیوں نہ کچھ دوسرے لوگ کھلم کھلا اسلامی نظام کی مخالفت کا علم اٹھائے میدان میں کام کریں اور کہیں کہ ہم ملحد اور کمیونسٹ ہیں، ایک مادہ پرستانہ سیکولر نظام چاہتے ہیں، ہیں اسلام وغیرہ سے کوئی مطلب نہیں ہے۔ یوں اگر ملے عام کے کھلے میدان میں مسابقت رہے تو بہت آسانی سے ادھر یا ادھر فیصلہ ہو سکتا ہے۔

جماعت اسلامی کا نام | بحث کا یہ پس منظر بنا چکنے کے بعد سلمری صاحب جماعت اسلامی کے نام پر اعتراض اٹھاتے ہیں اور وہ شاندار استدلال کرتے ہیں کہ آدمی عیش عیش کر اٹھتا ہے۔ فرماتے ہیں کہ اس نام کے معنی یہ ہیں کہ جماعت کے علاوہ دوسرے تمام لوگ اسلام کے دائرے سے باہر ہو گئے۔ جی ہاں! مسلم لیگ نام کی اگر ایک جماعت موجود ہو تو وہ گویا یہ کہتی ہے کہ اور جتنی بھی جماعتیں ہیں وہ مسلمانوں کی نہیں غیر مسلموں کی ہیں۔ اگر ایک جمعیت العلماء موجود ہو تو وہ گویا یہ کہتی ہے کہ ذریعہ یہ اعلان کرتی ہے کہ باقی سب جمعیتیں ”جہلاء“ کی ہیں۔ کوئی ادارہ خدمتِ خلق موجود ہو تو گویا یہ نام رکھ کر وہ دوسرے تمام اداروں کے بارے میں یہ کہتا ہے کہ وہ سب خدمتِ نفس کے ادارات ہیں۔ اسلامیہ کانٹ اگر کوئی

پایا جائے تو وہ گویا پکار پکار کر دوسرے نام کالجوں کا غیر اسلامی ہونا واضح کرتا ہے۔ "طلوعِ اسلام" نام کا کوئی جریہ نکلے تو اس کا سر ورق گویا دوسرے تمام جرائد کو "طلوعِ کفر" کا افتقار دیتا ہے۔ اداروں اور جماعتوں کو چھوڑ کر اسی دلیل سے افراد کو لیجیے تو ماننا پڑے گا کہ اگر کسی شخص نے اپنا نام غلام محمد رکھ لیا ہو تو گویا وہ دوسرے کروڑوں بھائیوں کے بارے میں یہ کہتا ہے کہ وہ محمد کے نہیں، کسی اور کے غلام ہیں۔ اگر کسی کا نام عبداللہ ہو تو وہ دوسروں پر بالواسطہ طریق سے یہ الزام لگاتا ہے کہ وہ عبادِ الشیطان ہیں۔ کوئی شخص اگر "سعادت" اپنا تخلص اختیار کر لے تو باقی دنیا پتھر کا تخلص خواہ مخواہ چپک جائے گا۔ یہ دلیل بازاری سطح کے لوگوں سے تو پہلے بھی سنی تھی لیکن اس پر بڑی مایوسی ہوئی کہ پاکستان کا ایک ممتاز اخبار نویس بھی اس کو ایک برہانِ قاطع بنا کے لے آیا۔ اس برہانِ قاطع کی بنیاد پر سلمیٰ صاحب چاہتے ہیں کہ جماعتِ اسلامی کے نام کو ممنوع (BAN) ٹھہرا دیا جائے۔ دلچسپ امر یہ کہ وہ یہ بھی اجازت مرحمت فرماتے ہیں، بلکہ کچھ اصرار بھی کرنے ہیں کہ ہماری جماعتوں کا پروگرام اسلامی اصول و مقاصد سے مالا مال ہونا چاہیے لیکن بس وہ اسلامی نہ کہلائیں، مٹھائی بنائیے، اس میں شکر ضرور ملائیے، اسے خوب میٹھا کر لیجیے لیکن اس کا نام مٹھائی نہ رکھیے۔ بلکہ حنظل رکھیے درنہ اگر آپ نے اپنی مٹھائی کا نام کہیں مٹھائی رکھ لیا تو آپ دوسروں کی مٹھاس کی نفی کرنے کے مجرم بن جائیں گے۔ آپ ایلو پیٹیک دواؤں کی دکان کھولیں تو اس کے بورڈ پر یہ واضح نہ کریں کہ یہاں ایلو پیٹیک دوائیں ملتی ہیں، بلکہ باہر یہ لکھیے کہ یہاں سے بھوسہ اور چارہ مل سکتا ہے۔

دنیا میں نام ہمیشہ حقیقتِ شے کو واضح کرنے کے لیے تجویز کیا جاتا ہے۔ پارٹیوں اور جماعتوں کے نام ان کی فکر اور ان کے پروگرام کو پیش کرنے والے ہوتے ہیں۔ اگر دنیا میں یہ لطائف کبھی نہیں پیش آئے کہ کیولسٹ، سوشلسٹ، جمہوری یا کسی اور نظریہ کی جماعت کو مطابق حقیقت ناموں سے موسوم کرنا قانوناً ممنوع قرار دے دیا گیا ہو تو آخر ایک اسلامی نظریہ رکھنے والی تنظیموں ہی کے لیے یہ طرہِ قانون کیوں گھڑ لیا جائے۔ کب جماعتِ اسلامی نے آپ کو منع کیا ہے کہ آپ اگر اسلامی نظریہ پر کام کرنا چاہیں تو اپنی کسی تنظیم کو اسلام سے منسوب نہ کریں۔ اسلامی نظریہ کی علمبردار اگر یہاں دوسروں جماعتیں بھی ابھر گئیں تو وہ ایک مقصد کے خادموں کی متعاون ٹیمیں بن کر کیوں نہیں کام کر سکتیں! ہم تو سلمیٰ صاحب کو دعوت دیں گے کہ وہ جس تصور کے ساتھ بھی اسلام کی خدمت کرنا چاہتے ہوں ہم اللہ کریں اور ایک اور اسلامی جماعت کی بنیاد ڈال دیں۔ اس میں جماعتِ اسلامی کا نام بے حیا رکھنا کوئی رکاوٹ نہیں ڈالتا۔ اگر حقیقتِ شے کو کسی بے ڈھنگے نام سے

موسم کر دیا جائے تو بالآخر وہ نام خود ہی اپنے معنی بدل دیتا ہے، مثلاً اگر جماعت اسلامی کا نام آپ کوہ ہمالیہ بھی لکھ دیں گے تو خود لفظ کوہ ہمالیہ کے معنی ایک دن جماعت اسلامی سو کے رہ جائیں گے۔

جماعتوں کو خلاف قانون قرار دینے کے معنی [لیکن اصل مدعا نام کو نہیں، بلکہ اس نام کے بہانے جماعت اسلامی کی تنظیم اور تحریک کو خلاف قانون قرار دلوانے کا پروپیگنڈا کرنا ہے۔ سلمی صاحب شوق سے یہ مہم شروع کریں لیکن وہ اپنے مرتبے کا کچھ ٹھوڑا بہت لحاظ کر کے یہ سوچیں کہ اس قسم کی بات زبان پر لانے کے معنی کیا ہیں۔ ایک جماعت کو خلاف قانون قرار دینا درحقیقت اس کے قتل کا معنی رکھتا ہے۔ جماعت کا قتل ایک نظریے، ایک نصب العین اور ایک پروگرام کو بچھانی دیتا ہے۔ آخر وہ یہ بچھانی کس بنیاد پر کسی کو دلوانا چاہتے ہیں — محض اختلافِ رائے کے گناہ پر! تو پوزیشن دی ہوئی جیسے کسی علاقے کا کوئی جابر جاگیردار جب یہ دیکھتا ہے کہ فلاں خود دار آدمی چونکہ میرے دیہات میں آکر میری ہاں میں ہاں نہیں ملاتا اور میرا عوام مجھ سے اختلافِ رائے ظاہر کرتا ہے تو وہ بیچ و باب کھا کر اس کے قتل کرانے کی سازش پر اترتا ہے۔ خود قتل نہیں کر سکتا تو کسی دوسرے کی منت سماجت کرتا ہے کہ کسی طرح یہ کاٹنا کال دو۔ سلمی صاحب غور کریں کہ اگر اسی پوزیشن کو وہ اختیار کرنے والے تھے تو آخر پورے ادارے میں جگہ جگہ آزادی رائے کا وعظ کینے کی تک کیا بیٹھی؟

رواداری کی ضرورت پر اتنا کچھ کہہ ڈالنے کے معنی کیا رہے؟ جمہوریت نوازی کے سارے حوصلوں کی پرواز بس اتنی ہی تھی؟

جاگتے ہوئے ضمیر کے ساتھ سوچئے کہ آخراں یہودیوں کی کڑوت آج ہم سے کس بنا پر خراجِ نفیس بھول کر تکی ہے؟ جنہوں نے عیسیٰ علیہ السلام کے لیے سول کی سزا تجویز کی تھی؟ ان جبارانہ زمانہ کے کارناموں کو آج ہم حقارت کی نگاہ سے کیوں دیکھتے ہیں جنہوں نے انسانیت کے بہترین خادموں کو استبداد کے کوٹھوس میں پیل دیا تھا؟ یورپ کے قرونِ مظلمہ کے ان تنگ دل حکام اور پادریوں کو ہم کیوں کوستے ہیں جنہوں نے گلیلیو اور نیوٹن جیسے اہل فکر پر جنسنا تنگ کر دیا؟ ہم ان یونانیوں کو کیوں کڑھن کے ساتھ یاد کرتے ہیں جنہوں نے سفرِ طر کو زہر کا پیالہ پینے پر مجبور کر دیا؟ ہم ان علمائے سو کا نام کیوں ذلت آمیز طریق سے لیتے ہیں جنہوں نے مسلمان بادشاہوں کے درباروں میں بیٹھ بیٹھ کر ہر اختلاف کرنے والے کے خلاف فتویٰ لگائے۔ جنہوں نے کہا میں یہ قتل کر رہا ہوں اس کو موت یا قید خانے کے حوالے

کڑکے چھوڑا؟ ان لوگوں کا گناہ صرف تنگ نظری اور کوتاہ ظرفی ہے جس کی وجہ سے انہوں نے اختلاف کی برداشت اپنے اندر پیدا کرنے کے بجائے یہ پسند کیا کہ انسانیت کے جو اوپنچے سے اونچے خادم ان کی ہاں میں ہاں نہ ملائیں ان کا نام و نشان مٹا دیا جائے۔ ان لوگوں نے کلمہ حق کہنے والوں، آزادی رائے کا مظاہرہ کرنے والوں اور تنقید کی صدا بلند کرنے والوں کے خلاف طرح طرح کے بہانے تراشے، بچکانہ استدلال گھڑے، نئی سے نئی منطقیں ایجاد کر لیں مذہب اور قانون کی حسب منشا کوئی تعبیر پیدا کر لی اور منتخب روزگار مہستیوں کے خون سے ہاتھ رنگے۔

اب دیکھیے کہ یہ آپ کا طبقہ ہے کہ جس کے قبضے میں تخت و تاج ہے۔ خزانے اور ذرائع و وسائل ہیں نشر و اشاعت کی طاقتیں ہیں، ریڈیو اور پریس ہے، نشیٹ پر واحد غائبہ جماعت ہے، حمایت میں بے شمار دماغ ہیں، پھر استبدادی قوانین و اختیارات ہیں، پولیس اور فوج ہے۔ دوسری طرف جماعت اسلامی ہے کہ جو تھوڑی سی تعداد اور اکل اور ان کی جیبوں سے نکلی ہوئی محدود سی رقوم اور ایک روزنامہ اور دو چار ماہنامہ اور سہفتہ وار جوائنڈ کے بل پر ایک فکر پیش کر رہی ہے۔ اگر اس کی فکر غلط اور باطل ہے اور اس کا پروگرام ہلک ہے اور وہ واقعی نامعقول طریقوں سے کام لے رہی ہے تو آخر آپ کے اس طبقہ کو کیا ہو گیا ہے کہ وہ رواداری کی کھلی فضا میں اتنی ہم گیر طاقتوں سے کام لے کر ایسے شکست نہیں دیتا۔ دلیل کے میدان میں کسی جماعت یا تحریک کو شکست دے دی جائے تو پھر چاہے چند سر چہرے آدمی اس سے کتنے ہی چھٹے رہیں وہ حالات پر اثر انداز ہونے کے قابل نہیں رہتے اور آسنبہ آسنبہ فاتح خیالات کی طاقت ان کو وکیل کر زندگی کے بعد ترین گوشوں میں بٹھا دیتی ہے۔ مگر اب کیا آپ لوگ دلیل کا میدان واقعی چھوڑ چکے ہیں کہ نوبت جماعت اسلامی کے نقل کے بہانے پیدا کرنے تک پہنچی ہے۔ دنیا کے جس گوشے میں آپ کا یہ ادارہ پڑھا جائے گا، انڈیا، پاکستان کے بارے میں کیا رائے قائم کریں گے۔ ہمارے معیار جمہوریت اور ہمارے ہاں کی رواداری اور ہمارے تعلیم یافتہ طبقہ کے ظرف کے بارے میں لوگ کیا اندازے باندھیں گے؟

سوچیے، اور ٹھنڈے دل سے سوچیے کہ آپ کا یہ حکمران طبقہ وہ ہے کہ جس کی طرف سے جماعت اسلامی کی پچاسوں بار خداز اور تحریب پسند کہا جا چکا ہے اور انڈیا، روس اور امریکہ میں سب سے زیادہ پروپگنڈا کی حد تک کئی کئی بار دلویا جا چکا ہے۔ ہم تو یہ سب کچھ سہتے چلے آ رہے ہیں، بلکہ اس سے اوپر یہ کہ سیفی ایکٹ کے حار، پھانسیوں اور قید کی سزائیں ضبطیاں اور زبان بندیاں اور قلم بندیاں سب کچھ صبر سے سہکتے رہے ہیں، لیکن دوسری طرف ایک جماعت اسلامی کا نام

اتنی ناقابلِ برداشت چیز ہو گیا ہے کہ آپ جیسے ممتاز صحافی اسے خلافِ قانون قرار دینے کے دلائل اداری صفحات میں پیش کرتے لگے ہیں۔ خدا سوچے کہ آج جو تاریخ بن رہی ہے اس میں اپنے لیے کیا مقام آپ پیدا کر رہے ہیں۔

مغرب زدہ ذہن | سلسری صاحب کی اس ہجرت کی ہمارے دل میں بہت قدر پیدا ہوئی کہ آپ نے اس بات کا صاف متنا اعتراف کیا ہے کہ ذہنوں پر غیر ملکی راج اور مغربی فکر و تہذیب کا گہرا اثر موجود ہے۔ لیکن برسرِ اقتدار طبقہ اور معاشرہ کے تعلیم یافتہ عنصر کا اس پہلو سے ڈیفنس کرنے کے بعد فوراً آپ نے دوسری جانب جا رہا نہ حملہ کر دیا ہے۔ یعنی مذہبی لوگوں کے جدید علوم سے بے بہرہ اور حالات کے تقاضوں سے نا آشنا قرار دے دیا ہے۔ اس موقع پر بھلا مولنا مودودی کو کیسے نظر انداز کیا جاسکتا تھا۔ مولنا احتشام الحق کے ساتھ ساتھ مولنا مودودی کا نام لے کر ان کی علمی حیثیت پر استہزام انگاری فرمایا ہے۔ افسوس ہے کہ ہم اس سطح پر جا نہیں سکتے کہ کسی کی حیثیت اور کسی کی علمیت کا ناپ تول کر سکیں۔ علم اگر کہیں ہوگا تو اپنا اعتراف خود کر لے گا، نہیں ہوگا تو محض نام کے سکے دیر تک نہیں چل سکتے۔ رنج ہوتا ہے کہ یہاں اگر سلسری صاحب ایسی پوزیشن اختیار کی ہے کہ جیسے دو طبقوں کا کوئی طبقاتی جھگڑا ہے اور سلسری صاحب ایک طبقے کے بالمقابل دوسرے کا دفاع کر رہے ہیں۔ اگر حالات کو انہوں نے واقعی اسی طرح سمجھا ہے کہ یہ ملا اور مشرک کشمکش ہے تو قطعی طور پر غلط سمجھا، کم سے کم جماعت اسلامی کی حد تک اگر ان کو پہلے سے معلومات نہیں ہیں تو ہم عرض کریں گے کہ اس کی صفوں میں دونوں طرح کے لوگ اکٹھے ہوئے ہیں، بلکہ جدید طبقے کے حلقوں سے نسبتاً بہت زیادہ تعداد میں لوگوں نے اس کی دعوت پر لبیک کہا ہے۔ سچ یہ ہے کہ ہم لوگ بعض اوقات معیاری علماء کی تعداد کی کمی کو شدت سے محسوس کرتے ہیں۔ یہی بین ثبوت ہے، اس بات کا کہ کشمکش طبقاتی نہیں ہے، ورنہ جماعت اسلامی کے لیے جدید طبقوں کے دروازے طبقاتی تعصب نے کبھی کے بند کر دیے ہوتے۔ معاملہ درحقیقت نہایت زوردار تاریخی تقاضوں اور مستقل نظریوں کی کشمکش کا ہے جسے ہم آخر میں مختصراً واضح کریں گے۔

خیر، اسی سلسلے میں فاضل مدیر اقبال کا ذکر چھپتے ہیں کہ ایسے چوٹی کے لوگ تو شاذ ہی ہو سکتے ہیں جو ایک ماحول میں پرورش پا کر اور ایک نظامِ تہذیب کے سخت تعلیم چل کر کے اچھے اور پھر آزاد ذہن کے ساتھ ایسی کمزوریوں کی نشان دہی کرتے اور اس کے بالمقابل ایک نئی فکر پیش کرنے کا کارنامہ انجام دیں۔ سب لوگ واقعی اس درجے کے نہیں ہو سکتے، لیکن قدرت ایسے ممتاز افراد سے قوموں کو اسی لیے نوازتی ہے کہ اوسط درجے کے دل و دماغ جو از خود ماحول اور وقت کی

تہذیب کے کمزور پہلوؤں کو نہیں سمجھ سکتے اور ان سے اوپر اٹھنے کے لیے کوئی فکر از خود حاصل نہیں کر سکتے، وہ خاص خاص تاریخی شخصیتوں کی فکر سے اپنے چراغ روشن کریں۔ لیکن آپ اقبال کو اٹھا کر غیر معمولی پن کے اونچے طاق میں رکھ دیتے ہیں اور یہ کہتے ہوئے اپنے آپ کو ماحول اور تاریخ کے حوالے کر دیتے ہیں کہ ہر کوئی اقبال تو نہیں بن سکتا۔ بلاشبہ ہر کوئی رسول اور مائیکسکو اور گاندھی اور محمد علی جناح نہیں بن سکتا، مگر ان سے فکر و عمل کا درس تو لے سکتا ہے۔

اقبال مرحوم کا اصل کارنامہ یہ ہے کہ اُس نے ملتِ اسلامیہ کے اُس دو گونہ تاریخی ردِ عمل کو سمجھ کر اپنے کلام میں جذب کر لیا جو گذشتہ ایک صدی کے مغرب کے سیاسی و تہذیبی غلبے کے تحت پروان چڑھا۔ ایک طرف اُس نے دورِ جدید کے مطالبہ سے علم و عمل کے میدانوں میں ترقی کرنے، حالات سے کشمکش کرنے، قوتوں کو سخر کرنے، جدید ذرائع و وسائل سے کام لینے اور جدید ادارت سے استفادہ کرنے کا وہ سبق لیا جو خود اسلام کا پڑھایا ہوا سبق تھا۔ دوسری طرف اُس نے نظامِ حیات کی بنیاد بنانے کے لیے مغرب کی مروجہ بیت سے بالاتر ہو کر اسلامی اصولِ فکر کو بغیر کسی مذمت و معذرت کے اپنایا۔ یہ دونوں تاریخی رجحانات خود ملتِ اسلامیہ کے اندر مغربی غلبے کے ردِ عمل سے پیدا ہو کر نمایاں ہو رہے تھے مگر دھندلے اور نیم شعوری تھے۔ اقبال نے ان کو اجاگر کر دیا اور اس طرح اس کے کلام نے تعمیرِ نو کے لیے ایک صمیم راستے کی نشان دہی کر دی۔ اس لحاظ سے اقبال کو دیکھیں تو وہ ہمارے قدیم مذہبی طبقے اور جدید روشن دماغ طبقے کے درمیان ایک لیے وسطی مقام پر کھڑا نظر آتا ہے جہاں دونوں اپنے آپ کو لا کر جمع کر سکتے ہیں اور ملت کی مادی طاقت یک جہتی سے تعمیرِ نو میں لگ سکتی ہے۔

اقبال اس وسطی مقام پر کھڑے ہو کر ایک فکری تحریک کر کے رخصت ہو گیا۔ بعد میں ٹھیک وہی موقف ہے جسے عملی تحریک کے میدان میں جماعتِ اسلامی نے اختیار کیا ہے۔ ورنہ اگر معاملہ مسرور ملّا کی طبقاتی کشمکش تک رہ گیا ہوتا تو اس سے پہلے دونوں طرح کی جماعتیں اور ادارات موجود تھیں، تاریخ میں کوئی خلا نہ تھا۔ کسی جماعت اور تحریک کے لیے اگر خلا تھا تو اسی ضرورت کے لیے تھا کہ دونوں قسم کے متضاد رجحانات کے درمیان کوئی طاقت اقبال کا نشان زد کردہ مقامِ اعتدال سمجھاں کے کھڑی ہو۔ چنانچہ امرِ واقعہ یہ ہے کہ جماعتِ اسلامی ایک طرف جدید علوم میں آگے بڑھنے، جدید ادارات سے استفادہ کرنے اور جدید ذرائع و وسائل کو کام میں لانے اور گرد و پیش کے حالات کو سمجھنے اور ان کا لحاظ رکھنے کا مسلک اختیار کئے ہوئے ہے اور دوسری طرف وہ یہ بھی چاہتی ہے کہ تعمیرِ نو اسلامی فکر و عمل

کی اساس پر یہ پس درحقیقت جماعت اسلامی ایک تاریخی تقاضے کا ظہور ہے اور یہ تاریخی تقاضا اتنا ملت گیر ہے کہ ہر ملک میں یہ کسی نہ کسی تحریک کی شکل میں نمودار ہو رہا ہے۔ اتنی بات البتہ درست ہے کہ یہ ہمہ گیر تاریخی تقاضا رائے عام کی پوری تائید اپنے ساتھ لے کر جس بھی شکل میں جہاں نمودار ہو رہا ہے، حکمران کلاس بہت برا فروخت ہو کر اس سے لڑ رہی ہے یعنی معاملہ مشر اور ملا کی کشمکش کا نہیں، بلکہ عوامی رجحانات اور حکمران کلاس کی کشمکش کا ہے۔ کائنات کہ اگر یہ طبقہ کشمکش کا راستہ اختیار نہ کرے تو تعاون کے لیے خط اعتدال سامنے موجود ہے۔

ایک متعین سیاسی و اجتماعی رہنمائی | اس سلسلے میں فاضل مدیر نے ایک متعین سیاسی و اجتماعی رہنمائی دینے پر اعتراض کیا ہے موصوف کی رائے یہ ہے کہ بس لوگ قرآن پڑھیں اور جدید علوم کے حصول میں لگ جائیں، جوں جوں افراد کے خیالات بنیں گے، ریاست اور معاشرہ ان کے ذریعے خود بخود اپنے آپ کو کسی شکل میں تعمیر کرتا جائے گا۔ اس سلسلہ کلام میں آپ فرماتے ہیں کہ کسی صورت میں بھی ہمیں یہ حق نہیں پہنچتا کہ آنے والی نسلوں کو نام نہاد اسلامی قوانین کی بیڑیوں میں جکڑ جائیں اگر آپ ان بیڑیوں میں آئندہ نسلوں کو جکڑ جانے کا حق نہیں رکھتے تو ان تمام نام نہاد غیر اسلامی قوانین کی بیڑیوں میں جکڑ جانے کا حق کہاں سے حاصل ہو جاتا ہے! پھر تو چاہیے کہ آپ معاملہ بالکل ہوا میں متعلق چھوڑ دیں؟ دوسرا سوال یہ ہے کہ کیا آئندہ نسلوں کے نام پر موجود نسلوں کو ان قوانین سے محروم رکھنا برحق ہو گا جس پر وہ ایمان رکھتی ہیں اور جن کو فلاح و بہبود کا ضامن سمجھتی ہیں آپ کہہ سکتے ہیں کہ نہیں موجودہ نسلیں ان پر ایمان نہیں رکھتیں۔ لیکن اس اختلاف رائے کا فیصلہ کون کرے گا؟ — اگر دینی فیصلہ کرنے والے ہیں جن کو آپ آخری امتحان قرار دیتے ہیں تو ہم عرض کریں گے کہ براہ کرم اپنا یہی فقہ، بلکہ اپنے یہ الفاظ "نام نہاد اسلامی قوانین کی بیڑیاں" قوم کے سامنے پیش کر کے استصواب کر لیجیے کہ کتنے افراد اس میں ایسے پائے جاتے ہیں جو اس طرز پر سوچتے ہیں اور یہ الفاظ اسلامی قوانین کے لیے استعمال کر سکتے ہیں۔ ان الفاظ میں جو ذہن بول رہا ہے، عوام کے کتنے ووٹ اس ذہن کے حق میں پڑیں گے۔ لیکن آپ کی توجہ ان الفاظ کو لکھتے وقت عوام کی طرف کبھی نہیں ہو سکتی، آپ نے تو اپنی طرف سے ایک قطعی فیصلہ دے دیا ہے اور انداز السیاسہ ہے کہ اسے زبردستی ملک بھر پر ٹھونسنا چاہتے ہیں "متعین سیاسی و اجتماعی رہنمائی" کا معاملہ یہ ہے کہ جب تک کوئی بات محض خطابت و صحافت کے میدان میں کی جاتی رہتی ہے، قطعیت اور تعین کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ لیکن جب معاملہ دستور بنانے، تعمیر معاشرہ کا خاکہ تیار کرنے اور ایک سیاسی نظام برپا کرنے کا ہوتا ہے تو ڈھیل ڈھالی باتوں کو قطعیت اور تعین کی طرف لانا پڑتا ہے۔ اگر کوئی صاحب فکر

ودعوت خود تعین کی طرف نہ جانا چاہیے اور محض اصولی گفتگو تک اپنے آپ کو محدود رکھے تو مخاطب خود تعین کا تقاضا کرتا ہے۔ مثلاً یہی صورت عملاً جماعت اسلامی کو پیش آئی۔ اس نے کہا کہ پاکستان میں اسلامی نظام قائم کیا جانا چاہیے۔ اس پر سوال ہوا کہ تفصیل سے بتائیے کہ وہ ہوتا کیا ہے۔ ادھر سے کہا گیا کہ دستور کو اسلامی بنیادوں پر بننا چاہیے۔ دریافت کی گئی کہ وہ اسلامی بنیادیں کیا ہوتی ہیں۔ چاہا گیا کہ معاشی مفاسد کی اصلاح اسلامی نظریات کے مطابق کی جائے۔ اس پر پوچھا جانے لگا کہ وہ اسلامی نظریات کیا ہیں اور ان سے معاشی مسائل کیسے حل ہو سکتے ہیں۔ پھر حریب دعوت دی گئی کہ سود کو حرام ہونا چاہیے تو جرح ہوئی کہ اس کے بغیر بنگلہ سٹم کے لیے کیا نقشہ دیتے ہو۔ اسی طرح کرید اور نفخ اور کرنٹ سوال نے آہستہ آہستہ پھیلے ہوئے نظریات کو تعین تک پہنچایا ہے اور یہ بالکل فطری صورت دور تعمیر میں دنیا کے ہر گوشے اور زمانے میں پیش آئی ہے۔ خود ہی آپ لوگوں نے پہلے اس تعین کے لیے ہر معاملے میں اصرار کیا اور اب خود ہی طعنہ دیتے ہیں کہ ہمیں کوئی متعین سیاسی و اجتماعی رہنمائی نہیں چاہیے۔ ہم تو لوگوں مول باتیں پسند کرتے ہیں۔ گول مول باتوں سے تعبیر نہیں ہوتی۔ ایک متعین رہنمائی آپ کو لینے نہیں آئی تو آپ کوئی دوسری متعین رہنمائی ہم پہنچائیں اور پھر فیصلہ عوام پر چھوڑ دیں۔ خود کوئی متعین سپر دے نہیں سکتے اور دوسروں سے لینے پر تیار نہیں۔ اس پیمیدگی کا حل کیا ہے اور ایسے پر تبصرہ ہو چکا، لیکن آخر میں ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ سلمری صاحب کے چھڑے ہوئے مسائل کی لڑائی میں ان کے اصل قابل حل مسئلہ کو سامنے لائیں۔ سلمری صاحب اپنے ادارے میں اس وسیع موضوع فکر کو صرف باہری باہر سے مس کر سکے ہیں لیکن اس کے اندر اتر نہیں سکے، کیونکہ درحقیقت ان کی تمام تر توجہ ہمارے اہم ترین تاریخی دلی پر اہم سے پیدا ہونے والی سطحی بحثوں پر مرکوز رہ گئی ہے۔ بہت کم لوگ ہیں جو اس بھاری پر اہم پر نگاہ ڈال کر اسے سمجھ سکے ہوں۔

ملتِ اسلامیہ پچھلے دو تین قرون سے غلامی کے خلاف جدوجہد کرتی ہوئی کرہ ارضی کے ہر گوشے میں آزادی سے ہم کنار ہو رہی ہے۔ آزادی کا آفتاب جب کسی سرزمین پر چمک اٹھتا ہے تو احساسات جاگ اٹھتے ہیں، ولولے کو پیش لیتے ہیں، عزائم ابھرنے لگتے ہیں اور جو کچھ فکر و شعور سمجھے سے بننا چلا آیا ہو وہ زندگی کی باگ ڈور تھامنے کے لیے میدان میں آجاتا ہے۔ پاکستان بھی آزادی کی صبح سے دوچار ہے۔ قدرتی طور پر اجتماعی زندگی حرکت اور اقدام اور نشوونما چاہتی ہے۔ یہ ایک ایسی کیفیت ہے کہ جب پیدا ہو جاتی ہے تو حالات کی رو کو اس جگہ روک کر نہیں رکھا جاسکتا جہاں وہ پہلے سے رخ بہتہ ہو کر گھڑی تھی۔ صبح کی شعاعوں کی گرمی نے رخ کو گھجلا کر سیال بنا دیا ہے اور

ہر سبیل چیز بہنا چاہتی ہے۔ آزادی نے ارادوں کو جگا دیا ہے اور ہر جاگتہ ارادہ اقدام کرنا چاہتا ہے جس حالت میں ہم آج کھڑے ہیں اس پر کسی ایک فرد کے اندر بھی اطمینان باقی نہیں رہا۔ قوم کا اجتماعی ذہن تبدیل چاہتا ہے۔ تاریخ کو ہم جکڑ بند کر کے موجودہ مقام پر کھڑا نہیں رکھ سکتے۔

لیکن اسے کس رخ پر آگے بڑھنے کا راستہ بنا کے دیا جائے؟

سب سے پہلے مغربی فکر و تمدن کی کشش ہمارے سامنے آتی ہے۔ ہم میں سے بعض لوگ چاہتے ہیں اور شاید خیر خواہی ہی کے جذبے سے چاہتے ہیں کہ ہماری قوم کو قدم بہ قدم اقوام مغرب کے پیچھے سیدھے مادہ پرستانہ فکر و تمدن کی راہ پر بڑھ جانا چاہیے۔ یہی راہ ترقی ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ محض چند افراد۔۔۔ ذہین سے ذہین اور خیر اندیش خیر اندیش افراد۔ کا چاہنا اس معاملے میں فیصلہ کن نہیں ہو سکتا۔ دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ اجتماعی شعور و ارادہ تاریخی عوامل کی زیر اثر کیا میلانات اختیار کر چکا ہے۔ اس لحاظ سے حالات پر کوئی رائے قائم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ زندگی کی سطح پر پیرتے رہنے کے بجائے اس کی گہرائیوں کی غواہی کی جائے اور حکیمانہ غیر جانبداری سے کھوج لگایا جائے کہ اس سمندر کی تہ میں کیا ہے جو اچھلنا چاہتا ہے۔

چند تاریخی حقیقتیں | اس عظیم مسئلے کی تحقیق کے لیے اندر اتر بیٹے تو چند اہم حقیقتیں ہمارے سامنے آتی ہیں :

ایک یہ کہ ہماری قوم مجموعی حیثیت سے اپنے مسلم ہونے کا احساس رکھتی ہے اور گہرا احساس رکھتی ہے۔ یہ احساس سخت درجے کے ناسازگار حالات میں بھی مٹ نہیں سکا بلکہ اس کی دو تنگ اتاری ہوئی جڑیں برابر بڑا حاصل کرتی رہی ہیں۔ دوسرے یہ کہ جہاں بلحاظ ایمان و عقیدہ اسلام کا پیرو اور علمبردار ہونے کا یہ احساس مرا نہیں ہے، وہاں دوسری طرف یہ شعور بھی افراد اور معاشرہ کے اجتماعی ذہن میں موجود ہے کہ ہماری عملی زندگی اور ہمارا اجتماعی نظام اسلامی بہ حال نہیں ہے۔ فراری ذوق نے اس شعور سے بچنے کے لیے ہزار پناہ گاہیں گذشتہ صدیوں میں تعمیر کیں، لیکن اس شعور کے حملے کی زد سے بچنا ممکن نہیں ہو سکا۔ اس شعور کو زندہ رکھنے میں قرآن و حدیث کے مطالعہ نے اہل پارٹ ادا کیا ہے۔

اس کے ساتھ مسلمان چونکہ اسلامی نظام کے دو سعادت کی زندگی تاریخ کا ایک باب نہایت محفوظ شکل میں سینوں سے لگائے چلائے آ رہے ہیں اور یہ تاریخ جوان کے لٹریچر، ان کے ادب، ان کی صحافت، ان کی خطابت میں پوری طرح رچی بسی ہوئی ہے، زندگی کے ایک ایک پہلو کے بارے میں۔۔۔ ان کو بول بول کے کہتی ہے کہ یہاں فلاں فلاں انحراف

کار فرما ہے۔

تیسرے یہ کہ اس قوم کا یہ احساس و شعور محض زینتِ دماغ نہیں بنا رہا بلکہ اس نے بار بار ذوقِ تغیر اس کے اندر پیدا کیا ہے اور اس ذوقِ تغیر نے یکے بعد دیگرے تجدید و احیائے اسلام کی تحریکیں اس کے دائرے میں پراکدی ہیں ان تحریکوں کا یہ نتیجہ بہر حال نکلا ہے کہ ذوقِ تغیر کی یہ لہر ہمیشہ موجود رہی ہے اور اپنا تاریخی اثر رکھتی ہے۔

چوتھے یہ کہ یہ مسلمان ہونے کا احساس اور علاءِ اسلام سے بڑے ہونے کا چھٹا ہوا شعور ایسی منزلتائیں ہیں کہ مسلمان ان کے بل پر ایک ایک ملک میں امپیریلزم اور سامراج کے خلاف لمبی لڑائیاں لڑے ہیں اور لڑ رہے ہیں۔ جب بھی وہ متحد ہوئے ہیں، جب بھی متحرک ہوئے ہیں اور جب بھی انہوں نے قربانیاں دی ہیں اسلامی آئیڈیالوجی کی ثبوت میں دی ہیں۔ بار بار کے تجربوں نے ان پر ثابت کر دیا ہے کہ یہی ان کی زندگی، ترقی اور سرگرمی کا اصل سرچشمہ ہے۔ پھر چونکہ آزادی کو انہوں نے فی نفسہ نصب العین بنا کر کبھی بھی کام نہیں کیا بلکہ کھوئی ہوئی اسلامی زندگی کو پالنے کی تمنا میں آزادی کو ایک ذریعہ و وسیلہ کی حیثیت سے چاہا ہے اس لیے ہر جگہ تعمیر نو کے لیے سب کی نگاہیں اسی آئیڈیالوجی پر مرکوز ہیں۔ پانچویں یہ کہ مغربی فکر و تمدن کے تسلط نے دوسری ایشیائی قوموں کا ذہن جس طرح اپنے سانچے میں کامیابی سے

ڈھال لیا ہے اور ان میں مادہ پرستانہ قومی یکولرنظموں کے لیے ایک واضح میلان پیدا کر دیا ہے، مسلمانوں پر اسے ایسی کامیابی نہیں ہوئی۔ اگرچہ مسلمان معاشروں پر اس کے گہرے اثرات پڑے ہیں اور چھوٹا مٹا ایک نہ ایک طبقہ ان میں مغربی اثرات کے سامنے بڑی حد تک مفتوح ضرور ہوا ہے، لیکن اسلامی آئیڈیالوجی کی ڈھال نے کو قوم کے اجتماعی ذہن و فکر نے اپنے آپ کو مغربی فکر و تمدن کے حملوں سے بچا لیا ہے۔ مسلمانوں میں مرغوبیت اور تقلید کا ایک حد تک پر تو ضرور پڑا ہے لیکن پوری طرح تنہا ردِ الٰہی کی نسبت نہیں آئی۔ وہ مخالفِ اسلام اثرات کے خلاف برابر لڑ رہے ہیں اور یہ لڑائی جاری ہے۔

چھٹے یہ کہ مغربی فکر و تمدن کا تجربہ اب اس حد تک مکمل ہو چکا ہے کہ اس کے کمزور اور فاسد پہلوؤں کے نتائج اور بہت ہی تلخ اور ناپاک کن نتائج۔۔۔ ابھر اھر کر سامنے آرہے ہیں۔ ان نتائج کی تلقین اور نیاہ کاری کو خود اہل مغرب محسوس کر رہے ہیں اور نت نئی پیچیدگیوں کے پیش آنے پر وہاں کے اربابِ علم و حکمت خود پریشان ہو رہے ہیں۔ اس صورتِ حالات نے مسلمانوں کو بروقت متنبہ کر دیا ہے۔

یہیں وہ تاریخی حقیقتیں جن کے ہمہ گیر اثرات نے ہمارے اجتماعی ذہن میں اسلامی فکر اور اسلامی نظریے کو پوری مضبوطی جمادیا ہے۔ یہ قوم کہیں بھی ہو، نہ مادہ پرستانہ نقطہ نظر اختیار کر سکتی ہے، نہ وطنی قومیت کو دل میں جگہ دے سکتی ہے نہ سیکولر ازم کو قبول کرنے پر تیار ہو سکتی ہے، نہ مغربی فکر و تمدن کی اندھی تقلید کر سکتی ہے، نہ کمینوزم کو جذب کر سکتی ہے اور نہ موجودہ حالت پر ترخ بستہ ہو کے بڑی رہ سکتی ہے۔ یہ قطعی طور پر اسلامی نظام زندگی ہی کی جانب رخ کر کے نیا سفر حیات شروع کر سکتی ہے۔ یہ صورت حال کسی ایک ملک کے لیے خاص نہیں، کرۂ ارضی کی تمام مسلمان آبادی اسی تاریخی کیفیت سے گزر رہی ہے۔ اسی تاریخی کیفیت نے ہر جگہ اسلامی تحریکیں برپا کر دی ہیں۔

تضاد اور کشمکش | سوال یہ ہے کہ یہ حرکت کیوں نہیں شروع ہوتی، اس میں رکاوٹ کیا ہے؟ رکاوٹ صرف یہ ہے کہ ہر جگہ قیادت کی باگ ڈور پہلے سے ایسے ایک طبقے کے ہاتھ میں ہے جو کچھ تو اپنے مناصب اور مفاد کی خاطر اور کچھ اپنے مغرب قبول کردہ جدید نظریات کے زیر اثر اجتماعی ذہن کے تاریخی رجحانات کا ساتھ نہیں دے رہا۔ یہ طبقہ عوامی میلانات اپنی توجہ کے تحت لے کے چلنا چاہتا ہے، اور چونکہ وہ اس سمت نہیں چلتے، لہذا ان کو کسی دوسری طرف بڑھنے سے روک رکھنا چاہتا ہے اسے بڑی غلط فہمی ہے کہ کبھی یہ اس کیفیت کو کسی فرد کی شرارت قرار دیتا ہے، کبھی سمجھتا ہے کہ یہ چند ملاؤں کا فتنہ ہے اور کبھی رائے قائم کرتا ہے کہ یہ فلاں دینی تنظیم کا اٹھایا ہوا طوفانِ فساد ہے۔ حالانکہ ایسے موثر تاریخی عوامل جب کام کرنے لگتے ہیں تو افراد اور تنظیموں کا پارٹ بجز اس کے کچھ نہیں ہوتا کہ وہ ان عوامل کے لیے ظاہری ذریعہ اظہار اور وسیلہ کار بنیتے ہیں۔ اس غلط جائزہ کی وجہ سے وہ عجیب و غریب تضاد اور وہ دلچسپ کشمکش نمودار ہوئی ہے جس میں ایک طرف ہماری ہزار سالہ تاریخی فریق بنی کام کر رہی ہے اور دوسری طرف ایک مختصر سا طبقہ اس کے سامنے مدافعتی پوزیشن لیے ہوئے ہے۔

یہ ہے وہ تاریخی تضاد (HISTORICAL CONFLICT) جو اصل عظیم مسئلہ ہے اور فوری طور پر قابل حل مسئلہ ہے۔ یہ وہ توجہ طلب صورتِ واقعہ ہے جس پر ہمارے اونچے دماغوں کو فکر و کاوش کی ساری قوتیں صرف کر دینی چاہئیں۔ مصر میں انون کو پھانسی پرٹھا دینے اور پاکستان میں جماعت اسلامی کو خلافِ قانون قرار دینے سے یہ گرہ بہر حال نہیں سلجھ سکتی۔ کسی کے پاس کوئی ایسا آمرانہ اختیار نہیں ہے کہ وہ اس تاریخی تضاد و کشمکش کو تختہ دار پر لٹا سکے اور کسی کے ہاتھ میں کوئی ایسی پادشاهی ہے کہ اس عظیم مسئلے کو خلافِ قانون قرار دے سکے۔ ہم سلمی صاحب سے بھی اور دوسرے تمام سوچنے سمجھنے والے

حضرات سے بھی درخواست کرنا چاہتے ہیں کہ اس اصل گفتی کو سلجھائیے۔

دو حل | یہ لایعنی نہیں ہے، بس صرف توجہ کی دیر ہے اگر ہمارے ذہن لوگ کشمکش کے سطحی مظاہر سے نیچے اتر کر اصل دیگر کشمکش سے نجات پانے کی فکر کریں تو نہ کسی انخوان مسلمان سے پھر کوئی خطرہ رہ جاتا ہے، نہ کسی جماعت اسلامی کے وجود پر اضطراب!

اس کا ایک حل یہ ہے کہ کسی تدبیر سے مسلمان قوم کو مسلمان ہونے کے احساس اور اسلامی زندگی کے شعور اور اس تک پہنچنے کی تمنا سے خالی کر دیجیے۔ اس کے بعد جو کچھ آپ چاہتے ہیں وہ ہو جائے گا اور کوئی ترغیب باقی نہیں رہے گا۔ لیکن کیا یہ ممکن ہے؟ خصوصاً جب تک قرآن موجود ہے، جب تک حدیث اور سنت کا ریکارڈ محفوظ ہے، جب تک دور رسالت کی تاریخ قوم کے حافظے پر ثبت ہے، جب تک اسلام کی روایات اور قدسی ہمارے لٹریچر، ہماری صحافت اور ہماری خطا میں رچی بسی رہے قطعاً ناممکن ہے! اسے اگر سطحی نظر کے ساتھ آپ ممکن تصور کریں اور جس وقت سے قومی مزاج بدلنے کی کوشش شروع کر دیں تو ایک تو مسلمان قوم کے اپنے ہی خون سے آپ کو ہاتھ رنگتے ہوں گے، اسلامی رجحانات کو نہایت سخت گیرانہ طریق سے مسلسل دبانا ہوگا، اور چونکہ یہ بالکل مر نہیں سکتے اس لیے ہمیشہ ان کے درپے رہنا ہوگا، اپنی قوم سے معاملات کو سالہا سال کے لیے لگا کر دنا ہوگا اور اس طرح کی لمبی کشمکش میں عمریں گزارنے کے لیے جمہوری فضا کو ختم کرنا ہوگا۔

اب سوچئے کہ اس جہلک اور تباہ کن حل کو اختیار کرنے کے دور رس نتائج کیا نکلیں گے؟ ملکی حالات مصر و ایران کے معیار پر جا کر س گئے اور بین الاقوامی لحاظ سے قومی وقار ختم ہو جائے گا۔ قوم کے دلوں بکھ کے رہ جائیں گے اور اس کی طاقتوں کو کسی بڑی تعمیری مہم میں استعمال نہ کیا جاسکے گا۔ آگے چل کے جب مزید رد عمل پیدا ہوں گے تو کمیونزم جیسے فتنوں کو ایڈیولوجی کے خلاف کی وجہ سے حملہ کرنے کا موقع ملے گا۔ اس وقت بچاؤ کرنے والی کوئی فکری طاقت موجود نہ ہوگی۔ علاوہ میں بین الاقوامی توڑ پھوڑ کے منہ کا مے میں اگر خدا نخواستہ کوئی برا حادثہ قوم کو پیش آگیا تو اس سے عمدہ برا ہونے کے لیے کوئی مؤثر ذہنی و اخلاقی سامان دفاع ہم نہ پہنچ سکے گا۔ بیسیوں سال ای حالت تعطل میں گزر جائیں گے اور قوم اپنی سے نہ نکل سکے گی۔ لیکن بیسیوں سال کے بعد بھی جب آپ جائزہ لیں گے تو معلوم ہوگا کہ اسلامی رجحان اب تک بھی مرا نہیں ہے بلکہ وہ خطرہ بدستور اپنی جگہ پرفائیم ہے۔ جیسے کہ ترکیہ میں تیس تیس سال کا عرصہ اسلامی رجحان کے خلاف حکمران طاقت نے معرکہ آرائی میں صرف کر دیا اور آج بھی وہاں حال یہ ہے کہ یہ رجحان بدستور کام کر رہا ہے اور اسے کچلنے کے لیے برابر قوم کا سرمایہ قوت برباد کیا

جانتا رہتا ہے۔ ذرا اگر جمہوریت کی فضا پیدا ہو جائے تو فوراً یہ ایک مضبوط تحریک کی شکل اختیار کر جائے گا۔ سوچئے کہ قومی قوتوں کو اس بے جا کشمکش میں جھونکتے رہنے کا حاصل کیا ہوا ہے۔

دوسرا حل یہ ہے کہ حکمران طبقہ ذرا سی لچک اپنے اندر پیدا کر لے اور نظریاتی ضد چھوڑ دے۔ وہ یہ حقیقت تسلیم کر لے کہ قوم میں اسلامی نظام زندگی کے لیے عوامی تقاضا کا رفرما ہے۔ وہ اس تقاضے کو لوح تاریخ پر باریک نظر سے پڑھے اور اسے قبول کر لے۔ بس فکر و نظر کی ذرا سی یہ تبدیلی اور ضد مند کے جذبات کی معمولی سی یہ قربانی صورتِ حالات کا پورا نقشہ بدل کے رکھ سکتی ہے۔ یہ ایک ایسا حل ہے کہ جو تاریخی تضاد و کشمکش کا خاتمہ کر کے ملت کی تمام طاقتوں کو ہم آہنگ کر سکتا ہے۔ اس حل کو اختیار کرنے سے قوم کو آئیڈیالوجی کی قوت محرکہ مل جاتی ہے، اسے ایک نئے اتحاد ہاتھ آتی ہے اسے ترقی کرنے کے لیے ایک رہنما قوت ہم پہنچ جاتی ہے، اور وہ دنیا کی عظیم قوموں کی صف میں شامل ہونے کے لیے تیار ہو سکتی ہے۔ اس حل کو قبول کر لینے سے ہمیں وہ اختیار مل جاتا ہے جس سے کمینوزم اور دوسرے باطل نظریات کے حملوں کو روکا جاسکے۔ اس صورت میں ہم ایک ایسی طاقت سے مالا مال ہو جاتے ہیں جو ہمیں بین الاقوامی حادثات کے طوفان میں چٹان کی ہی مضبوطی کے ساتھ قائم رکھ سکتی ہے۔

ہم سلمہی صاحب اور اپنے اکابر اور اس طبقے کے تمام ذہین لوگوں کو دعوتِ فکر دیتے ہیں کہ وہ ٹھنڈے دل سے اس حل پر غور کریں۔ آخر کیوں یہ بات بالکل ناممکن قرار دے دی گئی ہے کہ ملت پر اثر انداز ہونے والے تاریخی تقاضوں کا کوئی لحاظ نہیں کیا جاسکتا اور کیوں یہ ضروری سمجھ لیا گیا ہے کہ اسلامی تحریکوں کا خون بہا کر ہی آگے چلا جاسکتا ہے جو ناکام اور احمقانہ حل ناصری آمریت نے اختیار کیا ہے، آخر کیا وجہ ہے کہ پاکستان کے اکابر بھی اسی کو قابلِ تقلید مثال بنائیں؟

لے چنانچہ ذریعہ تدبیر دستور سے لوگوں کو یہی امیدیں تھیں کہ اس کے نفاذ سے ہم مذکورہ بالا تاریخی تضاد و کشمکش سے نجات پا کر ایک متحدہ طاقت کی حیثیت سے کام کر سکیں گے۔

لے غور فرمائیے کہ بنو امیہ کے عہد سے لے کر آج تک ذرا سی راج مہٹ کے لیے امت کے بہترین عناصر کا جتنا خون بہایا گیا ہے اور اس دہر میں بھی تزکیہ اور صیر میں ملت اسلامیہ کی جس فعال طاقت کو دریا برد کیا گیا اور کیا جارہا ہے، پھر خود پاکستان میں بھی عدم تعاون کی ہینس تشدد کر کے دینی طاقتوں کو جتنا کمزور کیا جارہا ہے، اگر اپنے ہاتھوں اپنی بربادی کی ہم اس طرح جاری نہ رکھی جاتی تو ہماری قوم تعمیر کتنی جلدی ہوتی اور ہم اپنے موجودہ مقام سے کتنے آگے ہوتے۔

کوئی نہیں کہتا کہ جدید حالات اور تقاضوں سے آنکھیں بند کر کے چلیے، کسی میں یہ انتہا پسندی کا رد نہیں ہے کہہ۔
پورے کا پورا اسلام آنا فانا یہاں سے وہاں تک چھا جائے، بلکہ سب لوگ تدریج کی اہمیت کو محسوس کرتے ہیں، کوئی نہیں
چاہتا کہ وہی تن تنہا سب کچھ (ALL IN ALL) ہو، کسی کو موجودہ حکمرانوں سے کوئی پٹا اور کد نہیں ہے کہ ان کو
ضرورت ان کے مناصب سے ہٹانا ہے اور اسلام کا نام ہی کد کو پورا کرنے کے لیے نقاب فریب کے طور پر استعمال کرنا ہے۔
آپ لوگ دوسروں کو سمجھنے کی کوشش کیجیے اور قومی عناصر اور طاقتوں کو باہم دگر بھاڑیے نہیں بلکہ زبان و قلم سے ان کو
قرب تر کرنے کی فکر کیجیے۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ اسلام کو کسی درجے میں اپنا بیٹے اور غلوں سے اپنا بیٹے اور پھر
تھوڑا یا بہت عملی کام کر کے دکھائیے جس دن آتی تبدیلی کا ثبوت ہمارے اکابر نے دے دیا اُس دن بالکل نئے جذبات
اور نئے حالات کے سرچشمے پھوٹ پڑیں گے۔ جو شخص اس صف میں سب سے پہلے آگے بڑھ کر یہ تجربہ کرے گا وہ خود دیکھ لے گا
کہ اس کے کتنے اچھے نتائج سامنے آتے ہیں اور کتنی بڑی قبولیت عامہ اس کا خیر مقدم کرتی ہے۔ سلمیٰ ضابطہ درخواست
کہ وہ اوپر کی بحث سے اگر کوئی ناگوار اثر بھی لیں تو اسے اس موقع پر زمین سے الگ کر کے ان نقاط فکر کے مطابق بھی ذرا
غور فرمائیں۔ پہلے حل اور دوسرے حل کے نتائج کے فرق کا جائزہ لیں۔ پھر اپنے ہی سامنے یہ سوال رکھیں کہ کیا یہ دوسری صورت
بالکل ناممکن ہے ؟

سلاجقت

(سَيِّدُ الْاَوَّلِ الْاَعْلٰی مَوْوَدِّی)

دولت عباسیہ کے سیاسی زوال کے بعد جس سلطنت نے ممالک اسلامیہ کے بیشتر حصہ کو ایک مرکز پر جمع کیا اور سلطانوں
سیاسی انتشار اور پرکندگی سے نکال کر دنیا کے سامنے عالم انسانی کا رہنما اور امام بنا کر آخری مرتبہ پیش کیا وہ سلجوقی سلطنت تھی
اس کے کارنامے مولانا کی اس تاریخی کتاب میں ملاحظہ کیجیے۔ قیمت : ۳/۸

طایر رسول قادری، سول انجینٹ، ۸۱ پیر غازی روڈ، اجپہر، لاہور

مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی (پاکستان) اور اپنے شہر کے کتب فروشوں سے حاصل فرمائیں